صفیہ عباد

منیر نیازی اور ناصر کاظمی کے موضوعات کا تقابلی جائزہ

تقابلی جائزہ اور اس کی اہمیت:

ہر دور میں تقابلی مطالعہ یا جائزہ کی ضرورت کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہ تقابلی جائزہ کہیں تو معاصرین میں ہوتا ہے۔کبھی قدیم اور جدید ادیبوں کے مابین ایک فکری اور موضوعاتی سطح پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔کہیں اس کی ضرورت مختلف ادوار کے موازنہ کی صورت ابھرتی ہے۔اس کے باعث مختلف رویوں کی ایک ہی عہد اور اس کے حوالے سے اختلاف کی نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ تقابلی جائزے کی بدولت کسی ادیب یا ادب کو چھوٹا یا بڑا،کمتر یا برتر ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ مندرجہ ذیل اہم نوعیت کے پہلو اور نتیجہ خیز نکات اس سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ شخصیت یا فن کے حوالے سے تقابلی مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسعت مطالعہ اور غور وفکر کی ضرورت اور صلاحیت کو جنم دیتا ہے۔

۲۔ اس کی بدولت فکری اور عصری رجحانات کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

۳۔ تحقیق اور تنقید کی نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

۴۔ تقابلی جائزے کے نئے حوالے اور صحت مند رویے سامنے آتے ہیں۔

۵۔ تقابلی جائزہ اجتماعی سطح پر بحث تنقید اور تبادلہ خیالات کی نئی نئی صورتیں پیدا کرتا ہے۔

۶۔ موازنہ اور تقابل کے باعث شخصیت،فن،عہد اور عصری تقاضے باہم مل کر نئے نئے نتائج کی تلاش کرتے ہیں۔

انگریزی ادب میں بھی تقابلی صورت حال کا حوالہ ملتا ہے۔ مثلاً W.Orth اور Frost دونوں کے ہاں ہمیں نیچر رفطرت ملتی ہے ۔ ایک کا تعلق انگلینڈ سے اور دوسرے

کا تعلق امریکہ سے تھا۔ دونوں کے ہاں نیچر کا حوالہ فرق ہے۔ W.Worth کے ہاں نیچر ایک اخلاقی درس رکھتی ہے۔ یہ ایک Kind ہے، قسم ہے، راہنمائی ہے۔ جبکہ فروسٹ کے ہاں نیچر ایک پس منظر ہے۔ یہاں اختلافی درس نہیں اور نہ راہنمائی ہے۔ اسی طرح W.Worth اور کولرج کا جب تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تو دونوں کا تعلق ایک ہی عہد ہے، ایک ہی سرزمین سے ہے۔ دونوں دوست ہیں۔ دونوں رومانی ذہن رکھتے ہیں۔ لیکن ایک نے فطرت کی بات کی۔ تو دوسرے نے مافوق الفطرت کو حوالہ بنایا۔ یہاں فرق انفرادی طرز احساس کا بھی ہے۔ اسی ضمن میں جب Teath اور ایلیٹ کی علامت نگاری کا ذکر آتا ہے تو دونوں کا علامتی انداز اس حوالے سے فرق ہوجاتا ہے کہ Yeats کی علامتیں آئرلینڈ کے حوالے سے ہیں۔ جب کہ ایلیٹ کے ہاں علامتوں کا استعمال General رعمومی طور پر ہوا ہے۔

شعر و ادب کسی بھی معاشرے کا ہو۔ وہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس سے اس عہد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور مختلف رویوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ادب سے ہمیں روایت کا ایک تسلسل بھی ہاتھ آتا ہے جو اس بات کا غماز ہوتا ہے کہ مختلف انسانی اور ادبی میلانات ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے کیا رہے اور کیا رہ سکتے ہیں۔

اردو ادب کی جو شعری اور ادبی روایت تقسیم سے پہلے چلی آ رہی تھی۔ آزادی کا سورج اس میں بے پناہ اضافوں اور وسعتوں کو سمیٹتے ہوئے طلوع ہوا۔ جہاں آزاد وطن اور نئی سرزمین کا حوالہ تھا۔ وہاں ہجرت، درد و الم، مہاجرین کے مسائل، فسادات کی خون آشامی، مختلف رشتوں سے بچھڑنے کا صدمہ، اداسی اور تنہائی کے کرب جیسے نئے موضوعات بھی اردو شعر و ادب کا نیا موضوع بن گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئی آزاد سرزمین پر خود غرضی، افراتفری، نفسانفسی اور اخلاقی قدروں کی پائمالی کا جو دور دورہ ہوا۔ یہ تمام حوالے نمایاں عنوانات کے ساتھ اردو شعر و ادب میں داخل ہو گئے کم و بیش تمام شعراء نے ہی ان موضوعات پر لکھا۔ بقول پروفیسر محمد اکرم:

''تقسیم کے بعد نئی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اس نوزائیدہ ملک

کو لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انسان نے انسان کے ساتھ
جس بربریت اور وسعت سے درندگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے
بھیانک مناظر سے ہمارے لکھنے والے دیر تک متاثر رہے اور ان کی
سوچ میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔"(۱)

ان شعراء میں دو نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ منیر نیازی اور ناصر کاظمی ۔ اس اجتماعی زندگی کے کرب میں ان کی ذاتی زندگی کے تلخ تجربے بھی گھلے ہوئے تھے ۔ مثلاً ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ ناصر کاظمی کے لیے لکھتے ہیں۔

"ناصر کاظمی خون کا دریا عبور کر کے پاکستان پہنچے تھے ۔ باقاعدہ رسمی
تعلیم سے محرومی ،کمتر مالی وسائل، سرکاری محکموں میں کلرکی
.........ان کی اداسی میں ان کی ذات کی محرومیاں بھی ہیں۔"(۲)

گھر بستی، وطن، شہر ،گلیاں ان کا ایک ہی حوالہ ہے ۔ آزادی کا ،تحفظ کا، اپنی تہذیب کا ، نئے سویروں کی نوید کا۔ اور رشتے ناطوں کی اس تلاش کا بھی جو حصول آزادی کی جدوجہد میں منظر سے غائب ہو گئے ۔ اب گھر بسیں یا بستیاں آباد ہوں۔ وطن کی آزادی کا سورج طلوع ہو یا بات اپنی تہذیب وسلامتی کے حوالے سے ہو۔ معاملہ ایک ہی ہے کہ شاعر اس گھر بستی، وطن، شہر اور گلیوں کو آباد دیکھنا اور آباد رکھنا چاہتا ہے ۔ منیر نیازی اور ناصر کاظمی دونوں کے یہاں اس موضوع پر بہت بات ہوئی ہے ۔ دونوں کا اپنا اپنا نقطہ نظر اور مخصوص طرز احساس ہے ۔لیکن بنیادی خیال اور موضوع کی اہمیت دونوں کے یہاں کم وبیش ایک سی ہے ۔ منیز نیازی اس حوالے سے جب بات کرتے ہیں تو اس موضوع کے بھی کئی پرت کھلتے جاتے ہیں۔

؎ اپنے گھروں سے دور بنوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لوگ
کبھی کبھی جب وقت چلے تو اپنے گھر بھی جاتے رہنا

لیکن جب گھر میں گھر کا نقشہ نہ ہو، اپنائیت کے در بند ہو جائیں ۔ رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ تو پھر شاعر کے سوچنے کا انداز فرق ہو جاتا ہے۔

؎ اب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
شام آگئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا

کبھی گھر اور جسم کا خارجی حوالہ ایک ہوجاتا ہے۔ اجنبیت کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔اپنے آپ سے ہی دوری کا کرب جاگ اٹھتا ہے۔گھر میں رہیں یا نہ رہیں۔ دل و دماغ اس حوالے سے کوئی واضح سوچ نہیں رکھتے۔ بے چینی ،بے کلی، احساس تنہائی اور کچھ پاکر بھی نہ پانے کی کیفیت ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

؎ منیر گھر سے نکل کے ہم بھی
پھرے بہت در بدر اکیلے

؎ اپنے گھر کو واپس جاؤ رو رو کر سمجھاتا ہے
جہاں بھی جاؤں میرا سایہ پیچھے پیچھے آتا ہے

؎ سواد شہر پہ ہی رک گیا تھا میں تو منیر
اور ایک دشت بلا میرے گھر کی راہ میں تھا

؎ مکان بے قبر جسے لوگ خود بناتے ہیں
میں اپنے گھر میں ہوں یا میں کسی مزار میں ہوں

؎ رات کے سنسان گنبد میں رچی ہے باس سی
پہرے داروں کی صداؤں کے طلسمی شور سے

جب کہ ناصر کے یہاں یہ انداز دھیمے پن میں نظر آتا ہے۔

؎ اب وہ دریا، نہ وہ بستی، نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

بقول فتح محمد ملک:

''منیر نیازی کی شاعری تحیر و تجسس اور خوف و ہراس کے جو منظر دکھا رہی تھی۔ نئے شاعروں کی ایک پوری کھیپ ان پر یوں فریفتہ ہوئی کہ اس کے ہاں دشت و سراسیمگی سکہ رائج الوقت بن گئی۔ مگر ان

میں سے کوئی بھی منیر نیازی کی تقلید نہ کر سکا۔" (۳)

دہشت، ڈر اور خوف کے عناصر بھی اس تجسس اور تحیر سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی صورت حال واضح نہیں ۔شکوک و شبہات کی فضا ہے ۔ غیر یقینی انداز ہے ۔کیا سوچا تھا اور کیسی فضا اور کیسا ماحول در پیش ہے۔منیر اور ناصر کاظمی دونوں کے ہاں اس کیفیت کا اظہار اسی حوالے سے ہوا ہے ۔منیر کا کہنا ہے:

؎ شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

جب کہ ناصر کہتا ہے:

؎ کیسی اندھیری رات ہے دیکھو
اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے

منیر کے ہاں ہجرت اور فسادات کی یادوں نے بھی خوف و ہراس اور سحر و آسیب کا حیرت کدہ سا بنایا۔

ہجرت اور فسادات ،ایک اور اہم موضوع اور حوالہ ہے جو دونوں شاعروں کے ہاں ملتا ہے ۔یہاں دونوں کے طرز احساس میں شدت، رنج اور درد مندی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ایک وہ یادیں جو ہجرت کے حوالے سے ماضی بن گئیں ۔دوسرا وہ رخ جو اب نئی صورت حال میں سامنے موجود ہے ۔مثلاً ناصر کا گزشتہ سفر سے متعلق کہنا ہے:

؎ رو داد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

؎ آکے منزل پہ آنکھ بھر آئی
سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

جب کہ منیر نیازی کا کہنا ہے:

؎ آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

؎ یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

؎ لیے جاتی ہے سارے خواب میرے
یہ رت ہجرت کا عالم ہو گئی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہجرت دونوں کا تجربہ ہے۔ وہ حادثہ جو دونوں شعراء پر گزرا اور جب آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ تو معاشرتی زندگی کی ناہمواری، خود غرضی کی دنیا، اور انسانی رویے ہی کچھ اور تھے۔ سماج کا داخلی اور خارجی پیکر متصادم ہو کر ٹوٹ رہا تھا۔ یہاں پھر اس منظر پر مبنی موضوعات ان کی شاعری میں جگہ بناتے ہیں۔ ناصر کا کہنا ہے:

؎ دن دہاڑے یہ لہو کی ہولی
خلق کو خوف خدا کا نہ رہا

؎ کیسی آئی بہار اب کے برس
بوئے خوں ہے ایاغ میں گل کے

سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا یہ شہر، گھر، زمین، بستی وہی تھیں جن کے لیے قربانیاں دی گئیں۔ کیا جس احساس تحفظ کی تلاش کا سفر تھا۔ تکمیل سفر میں یہ ثمر ہاتھ آیا اور اگر نہیں آیا تو پھر اس نکتے پر حقیقت اور تخیل کا تصادم زور پکڑتا ہے۔ ذہین اکتا جاتا ہے۔ انسانی رویوں کی ناہمواریاں اور شہر والوں سے گلہ شکوہ بڑھنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی شکایت اپنے سے ہی ہے۔

؎ عادت ہی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

جب کہ ناصر کاظمی کا کہنا ہے:

؎ دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

یہاں بھی شہر،بستی، وطن میں وہ زندگی شاعر کو نہیں ملی۔ جس کے لیے روح نے زمانوں کا سفر طے کیا۔ اداسی اور محرومی سے پھر بھی دل آزاد نہ ہو سکا۔

ے ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

نیا ماحول،آزادی کا نیا سویرا طلوع ہو کر بھی ان اجالوں کی نوید نہ بن سکا۔ نگاہیں جس کی متلاشی تھیں۔ خالی مکان اور چاردیواری کا تصور بہتوں، گھروں اور شہروں کو آباد نہ کر سکا۔

ے یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ

ے چلے دل سے امیدوں کے مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

صورت حال یہ ہے کہ گھر ہو یا بستی، وطن ہو یا شہر، ان کی آبادی اور رونق انسانی رشتوں کے خلوص، دردمندی، اپنائیت اور اعلیٰ اقدار کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سماجی زندگی جس طور سے اتھل پتھل تھی۔ امن و امان کی دگرگوں حالت بے اعتباری، نفسانفسی، خودغرضی اور ذاتی مفاد کے حصول میں سب کے سب سرگرداں۔ یہ اجتماعی بے چینی باہمی اعتبار و اعتماد کے در بند کر دیتی ہے۔ خودفریبی جینے نہیں دیتی۔ ناصر اور منیر نیازی دونوں کے یہاں اس کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ مثلاً ناصر کاظمی کا کہنا ہے۔

ے بہت ہی سادہ ہے تو اور زمانہ ہے عیار
خدا کرے کہ تجھے شہر کی ہوا نہ لگے

ے دل میں بے تاب ہیں کیا کیا منظر
کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو

جب کہ منیر نیازی کے یہاں یہ صورت حال کچھ اس طرح سے ہے۔ جیسے بہت کچھ سہ کر اب انتقامی رویے سر اٹھاتے ہیں۔ لب و لہجہ میں تلخی آ جاتی ہے۔ اکتاہٹ کے ساتھ ساتھ ذہن بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اندر ہی اندر سہنے، کڑھنے اور جی جلانے کی

کیفیت لمحہ بھر کے لیے جیسے ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

؎ اس شہر سنگدل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے
؎ ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اس زمین پہ اٹھا دینا چاہیے

لیکن ایسا انداز ان کے یہاں کم کم ہے۔ کیونکہ سماج کا منظر نامہ اور انسانی رشتوں کی بے اعتدالیاں جس تواتر اور تندی کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہیں۔ اس سے حیرت اور تجسس کی فضا جنم لیتی ہے۔ ایک تحیر اور آسیب زدگی کی فضا ہے۔ جو چاروں اطراف احاطہ کیے ہوئے ہے۔

حیرت اور تجسس کی کیفیت دونوں کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن ناصر کاظمی کے ہاں انداز قدرے دھیما ہے۔ ایک سوچ بچار والی کیفیت ہے۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔ کیا ہوا والی بات ہے۔ جب کہ منیر کے ہاں اک گنبد مینائی اور طلسماتی فضا ملتی ہے۔ حیرت اور تجسس کی کیفیت میں شدت ہے۔ تندی و تیزی ہے۔ جو اس پر ایک طلسم چھایا ہوا ہے۔

؎ منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

منیز نیازی اسی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

؎ میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا
؎ کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں

ان کے مجموعے 'ماہ منیر' میں زیادہ تر نظمیں بھی ایسے ہی عنوانات کے تابع آتی ہیں جن میں وطن، ہجرت، آزادی اور دیگر ایسے موضوعات ملتے ہیں۔ مثلاً جن گھروں سے ہم نے ہجرت کی۔ اپنے وطن پر سلام، اپنے شہروں کے لیے دعا، ہجرت کا ثمر، یہ کیسا نشہ

ہے ۔ میں کس عجب خمار میں ہوں ۔ وغیرہ:

یہیں سے دریافت کا ایک پہلو جنم لیتا ہے ۔ یہ ایک پر خطر سفر ہے ۔ جس میں بڑے عزم کی ضرورت ہے۔ اندر اور باہر کی دنیاؤں کا تصادم، اپنے ہونے یا نہ ہونے کا ثبوت اور گواہی، ایک یقین کی تلاش ساتھ ساتھ ہے ۔ لیکن دونوں شعراء نے کمال مہارت سے خارجی رنگوں کے حوالے سے داخلی کیفیات کو زبان دی ۔ اور داخلی دنیا کو خارجی حالات سے ہم آہنگ کیا۔ بقول فتح محمد ملک:

''دریافت کے اس اکیلے پر خطر سفر میں منیر اندر کی دنیا میں بھی دور تک گئے ہیں اور باہر کی دنیا میں بھی ، رو بہ زوال دنیا کو منیر نے باطن میں جذب کیا ہے۔ تو اندر کی بے چین کائنات کو خارجی پیکر عطا کیے ہیں۔'' (۴)

اس حوالے سے ایک نقاد کا ناصر کاظمی کے لیے کہنا ہے:

'' ناصر کاظمی نے اپنے باطن سے ظاہر کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف ہجرت کی۔ آزادی کے سورج نے نفس اور وجود کو جس ، حدت اور گرمی اور جس خاک و خون سے روشناس کروایا تھا۔.......... ناصر نے اپنی روح کی گہرائیوں میں اس عظیم اضطراب کو پناہ دی ۔'' (۵)

اور پھر دونوں کے ہاں اس حوالے سے ایک خاص بلند حوصلگی، امید اور رجائیت کا عنصر بھی جنم لیتا ہے۔ جو ان کی سوچ کو متحرک اور فعال بناتا ہے۔ یہ بلند حوصلگی ایک طرف تو درپیش مسائل سے نبٹنے اور دوسری طرف ایک نئے سویرے کی تعمیر کا خیال بھی بنتی ہے ۔مثلاً ناصر کا کہنا ہے:

؎ مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دور صبح گاہی

ے کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا
ے ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
شب زدہ آنکھ اٹھا کر دیکھ

اور منیر نیازی کے ہاں یہ صورت حال کچھ اس طرح سے ہے:

ے چلا میں صعوبت سے پُر راہ پر
جہاں تک مجھے انتہا لے گئی
ے صبر اک طاقت ہے میری سخت ایام میں
اس صفت سے آدمی غم میں فغاں کرتا نہیں

منیر کی بلند حوصلگی زیادہ تر ذات کے حوالے سے ثابت قدمی کا اظہار بھی ہے۔ جب کہ ناصر کاظمی کا یہ رویہ زیادہ تر اجتماعی بھی بن جاتا ہے۔ لیکن ایک نئی اجتماعی زندگی کے سویرے کا تصور بھی منیر کے ہاں موجود ہے۔

ے دیکھو منیر بہار میں گلشن
رنگ سے اٹتے جاتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ سماج کے ناموافق رویے جب سر چڑھ کر بولتے ہیں اور فنکار بہت کچھ سوچنے، کرنے اور کہنے بھی اس متصادم کیفیت کی کشاکش سے بچ نہیں سکتا۔ جو اس کے اور معاشرتی رویوں کے بیچ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں حساس ذہن تنہائی کا کونہ بھی آباد کر لیتا ہے۔ بلکہ تنہائی کی یہ دنیا خود بخود اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جو بھری بزم اسے تنہائی کا زہر پلاتی رہتی ہے۔ محفلیں، ہنستے بستے اور زندگی کے بھرے میلے میں بھی وہ تنہائی کی اس صلیب کو کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے۔ منیر نیازی اور ناصر کاظمی دونوں کے یہاں تنہائی کا موضوع بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس تنہائی کا ایک سرا اپنی ذات کی تلاش، دوسرا سرا انسانی اقدار کی تلاش، اور تیسرا سرا دھیمے دھیمے سر میں شکوہ، شکایت کے ساتھ وابستہ ہے۔ گویا تنہائی کا یہ پہلو بے بسی، مایوسی اور

ناامیدی کے صحرا میں گم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ فعال ہے۔ جسے سفر کو جاری و ساری رکھنے کا ایک بہانہ ہو۔منیر نیازی کے لیے ڈاکٹر وقار احمد رضوی لکھتے ہیں:

'' وہ اپنی ذات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان کی آواز درد کو جھٹلاتی نہیں ۔ بلکہ بڑے شہروں میں ہر کر تنہائی اور افسردگی کے دشت میں گم ہوجاتی ہے ۔ اس لیے ان کی شاعری میں دھوپ، درخت، دریچے، شہر، ویرانے اور سمندر کا ذکر ہے۔'(۵)

منیر کے ہاں احساس تنہائی کی لہر بہت شدید ہے ۔ اپنی ذات کے اندر ہی رہنا۔ خود سے ہی کچھ کہنا:

ے زمانے کے لب پر زمانے کی باتیں
میری دکھ بھری داستان میرے دل میں

ے کتنے یار ہیں پھر بھی منیر اس آبادی میں اکیلا ہے
اپنے ہی غم کے نشے سے اپنا جی بہلاتا ہے

ے وہاں رہے تو کسی نے بھی ہنس کے بات نہ کی
گئے وطن سے تو سب یار ہاتھ ملنے لگے

ناصر کے ہاں بھی تنہائی کا ایک جہاں آباد ہے:

ے شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

اتنی خلقت کے ہوتے شہروں میں ہے سناٹا

ے سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غم کا صد کارواں دیکھا نہ جائے

ناصر کے یہاں احساس تنہائی کا ایک تار ہجرت اور فسادات کے حوالے سے بھی کہیں کہیں بند ہوجاتا ہے۔

اردو شاعری میں یاس، دکھ، اجتماعی کرب جب اپنی انتہا پر پختہ فکری سے ہم کنار

ہوتا ہے تو اکثر ایسا ہوا اور یہ ایک فطری امر بھی ہے کہ زندگی کی ناپائیداری اور موت کی حقیقت کی آہٹ جیسے دہلیز پر سنائی دینے لگتی ہے۔ یہ ہماری اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کا بھی حصہ ہے۔ دہلوی دبستان کے شعراء نے بھی اس موضوع کو کمال مہارت برتا۔ جس میں زندگی اور موت کے فلسفے کی رنگ آمیزی نے شاعری کے مزاج اور معیار کو سنجیدگی اور شور سے بھی ہمکنار کیا۔ منیر اور ناصر کاظمی کا بھی عکاس ہے۔ تو دوسری طرف یہ ان کے عہد کے انتشار اور اجتماعی بے چینی کا بھی ردعمل ہے۔ منیر اس حوالے سے کہتے ہیں:

؎ یہ جبر مرگ مسلسل ہی زندگی ہے منیر
جہاں میں اس پہ اختیار کس کا تھا

؎ عارضی تھا مقام اپنا منیر
خواہش زیست تھی دوام طلب

جب کہ ناصر کاظمی کے ہاں یہ موضوع اس طور پر برتا گیا ہے۔

؎ نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی ناصر
بس ایک جبر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی

؎ موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ میری بزم میں آ غور سے سن

یہاں اسی پہلو سے یہ نکتہ بھی ابھرتا ہے کہ زندگی اور موت کی اصل حقیقت جب دل و دماغ پر منکشف ہوجائے۔ تو فکر کی ایک دھیمی دھیمی لہر مزاج کا حصہ بننے لگتی ہے۔ اسی سے زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا قرینہ ہاتھ آتا ہے۔ اسے پختگی فکر کے ساتھ سمجھنے کا سلیقہ ملتا ہے۔ ناصر اور منیر نیازی دونوں کی شاعری میں اس حوالے سے اشعار ملتے ہیں۔ کہیں خدا کی خدائی ہے تو کہیں گردش زمانہ کی بات، ایسے میں تمام دکھ، غم اور ناآسودگیاں طاق پہ رکھ دی جاتی ہیں۔ ناصر کا کہنا ہے:

؎ اس گوشے میں ہے سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سن

ناصر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلق خدا کچھ کہتی ہے

منیر نیازی کے ہاں یہ صورت حال کچھ اس طرح سے ہے:

مجھ سے بہت قریب ہے تو پھر بھی لے منیر
پردہ سا کوئی میرے تیرے درمیان تو ہے

یاد بھی ہیں اے منیر اس شام کی تنہائیاں
ایک میدان ،اک درخت اور تو خدا کے سامنے

منیر اور ناصر کاظمی دونوں کے یہاں ایک اور قدر مشترک بھی ہے ۔ جسے ہم تہذیبی شعور کی پاسداری کہہ سکتے ہیں۔ تہذیبی شعور ہماری شعری و ادبی کلاسیکی روایت کا حصہ بھی ہے اور اس میں انفرادی مزاج کا اپنا بھی حصہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کس روایت کے کس حصے کو کہاں سے ساتھ لیتا ہے۔ اور کہاں اپنی انفرادیت کو بھی سموتا ہے۔ دونوں شعراء نے تہذیبی شعور اور اقدار کی پاسداری کو اپنے اندر جذب کیا اور خود ان کے اپنے مزاج میں بھی شائستگی کا یہ عنصر موجود ہے ۔ ناصر کے بارے میں ناہید قاسمی لکھتی ہیں:

''ناصر نے میر کی روایت کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب ان کے بیان ان کی اپنی غزل اگی تو اس میں یہ سریت اس طرح گھل مل گئی تھی کہ الگ سے پہچانی نہ جاتی تھی۔'' (۶)

تو گویا روایت اور انفرادیت سے مل کر جداگانہ رنگ و جود میں آتا ہے۔ دونوں شعرا کے یہاں اس شائستگی کا اعلیٰ معیار، ذوق، رکھ رکھاؤ، محبوب سے معاملات کا قرینہ، حجاب اور پاس وضع کی صورت حال ہے ۔ اس رکھ رکھاؤ کی کیفیت اس وقت خاص طور پر وہاں ملتی ہے ۔ جہاں مجازی عشق کے حوالے سے بات ہوئی ہے ۔ تو معاملہ محض جمال پرست نگاہ، فراق کی کیفیت ہی میں رہنا اور محبوب کے سراپے تک محدود رہتا ہے ۔ مثلاً منیر نیازی کے ہاں اس کا حوالہ اس طرح سے ہے:

؎ یہ لڑکی جو اس وقت سر بام کھڑی ہے
اڑتا ہوا بادل ہے کہ پھولوں کی لڑی ہے

؎ بسنے لگے ہے ندی اک سرخ رنگ مے کی
اک شوخ کے لبوں کا لعلیں ایاغ چمکا

؎ منیر پھول سے چہرے پہ اشک ڈھلکے ہیں
کہ جسے لعل سم رنگ سے پگھلنے لگے

جب کہ ناصر کاظمی کہتے ہیں:

؎ آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھرتھرائے

؎ رنگ کھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات

یہی وضع داری اور تہذیبی اقدار کا سلیقہ محبوب سے ململا کے وقت بھی درپیش ہے:

؎ میں ہاتھ نہیں اسے لگایا
اے بیکسی گواہ رہنا

؎ اے دل نہ تڑپ کہ قہر ہوگا
رسواء کوئی شہر شہر ہوگا

ناصر کے یہاں اس انداز میں میر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہی تہذیبی روایت کو سلیقے سے برتنے کا نام ہے مثلاً میر کہتے ہیں:

؎ دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناصر کاظمی اور منیر نیازی کی شاعری تقسیم کے بعد اور ہجرت کے حوالے سے بہت سے موضوعات میں یکساں ہے۔ جس میں کلاسیکی شاعری کی روایت کا رنگ بھی گھلا ہوا ہے۔ فرق صرف دونوں کے طرز احساس اور رویوں کا

ہے ۔بعض مقامات پر کبھی ان کا لب و لہجہ فرق ہوجاتا ہے اور کہیں شدت تاثر میں انداز فرق ہوجاتا ہے ۔ دونوں نے ماضی، حالی اور مستقبل کے حوالے سے بات کی ہے ۔ جدائی کا کرب، ہجرت کا موضوع، نئے سویروں کی آرزو، یاس ، رنج و الم، امید ، اپنی سرزمین سے محبت اور ہجر و فراق کے قصے دونوں کے یہاں موجود ہیں۔تہذیبی شعور کی صورت حال کم و بیش دونوں کے یہاں یکساں ہے۔

دونوں کے ہاں قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ہجرت کے تجربات اور اس کے کرب سے دونوں یکساں گزرے۔ ماضی کی یادیں اور بچھڑنے والوں کی یاد کی خلش دونوں کے لیے سرمایہ حیات ہے ۔پھر اپنی مٹی اور زمین سے محبت کی خوشبو دونوں کے خمیر میں گھلی ہوئی ہے ۔ ناصر کاظمی کا مجموعہ کلام نشاط خواب زیادہ تر ایسی نظموں پر مشتمل ہے جو وطن کی محبت میں سرشار ہیں۔ دونوں کی زندگی اور فن کی دنیا کو باہم مربوط کیا ۔شاعری کے پس منظر اور شاعر کے ذہنی عکس میں کیا کیا تصویریں اور رنگین زمانے ہوتے ہیں ۔ اس تک پڑھنے والے کم کم پہنچ پاتے ہیں۔ ناصر کاظمی اس حوالے سے ''برگ نے'' کے پیش لفظ اعتبار نغمہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''شعر کی ماہیت پہ سوچنے والے عموماً شاعر کو بھول جاتے ہیں ۔اس شاعر کو جو بھیس بدل بدل کر ہر زمانے میں نئے جلوے اپنے ساتھ لے کر آتا رہا ہے۔ ہمارے زمانے کا شاعر کئی اعتبار سے اکیلا ہے ۔ بدلتی ہوئی دنیا کا عکس اور شاعری میں شاعر کا فرار ایک بہانہ تھا۔ جو روح عصر اپنے فرار کے لیے ڈھونڈ رہی تھی ۔ شاعر نے اس بادے کا بھیس بنا رکھا تھا۔ جو ہر گاؤں کے گرد اگرد چکر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔''(۷)

یہاں ذات اور کائنات کے حادثات و تغیرات اکائی بن جاتے ہیں اور جسے روح عصر کہا گیا ہے۔ اس میں ماضی اور بیتے زمانے کی چاپ بھی بخوبی سنائی دیتی ہے ۔ جو منفی نہیں ، مثبت ہے۔ جو گویا قربان گاہ کے بعد اس کا ثمر دیکھنے کی بھی خواہش مند ہے ۔

اس حوالے سے سہیل احمد منیر نیازی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"منیر نیازی کی شاعری ایک طویل جلاوطنی کے بعد وطن کی پہلی جھلک دیکھنے سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس شاعری میں حیران کر دینے والے اور بھولے ہوئے گم شدہ تجربوں کو زندہ کرنے کی ایک ایسی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اس عہد کے کسی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی۔ منیر نہ صرف مجھے میرا بچپن یاد دلاتا ہے۔ بلکہ بچپن اور بہشت کی سرحد پر میرے لہو میں گم شدہ بعض نادیدہ بستیوں کو بھی میرے سامنے لاتا ہے۔ جہاں گھروں کی دیواروں پر مور بیٹھے رہتے تھے۔ آموں کے باغوں میں کوئلیں بولتی تھیں۔"(۸)

ان اقتباسات میں ناصر نے شاعر کو اپنی ذات کے حوالے سے وہ باوا کہا جو لوگوں کو آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ اور منیر نیازی کے حوالے سے وہ یادیں سامنے آتی ہیں۔ جو ماضی کا کھویا ہوا مگر بہت اور بچپن کا حوالہ ہے۔ گویا ان دونوں کا فن ماضی ،حال اور مستقبل کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ وہ فن جو زندگی سے لبریز ہے۔ جو ذات کی پیغمبری اور کائنات کے الہام پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں اپنے عہد کی بھرپور آواز ہیں۔ وہ آواز جو اپنے عہد کے بھرپور کرب کو ساتھ لے کر چلتی ہے لیکن انفرادی رویوں کے اختلاف کے باعث ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوجاتی ہے۔ یہ اختلاف موضوعات کی خارجی سطح کی بجائے داخلی سطح پر محسوسات اور تاثرات کی ادائیگی کے حوالے سے دکھائی دیتا ہے۔ جہاں یہ ادائیگی کبھی دھیمے اور کبھی شدید سروں کی لے میں ایک دوسرے سے راستے بدل بھی لیتی ہے۔

❖•❖•❖•❖•❖

حوالہ جات

۱۔ محمد اکرم، پروفیسر: تاریخ ادب اردو، علمی بک ہاؤس، چوک اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۴۰۰

۲۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر: اردو ادب بیسویں صدی میں ، علمی کتاب خانہ، اردو بازار ،لاہور، س۔ن، ص ۴۷۹

۳۔ فتح محمد ملک، منیر نیازی، ایک تاثر ،فنون ماہنامہ، احمد ندیم قاسمی، جلد ۱۱، مئی جون ۱۹۷۰ء، ص ۳۵

۴۔ ایضاً،ص ۳۷

۵۔ تخلیقی ادب ، پاشا رحمان، مشفق خواجہ، ۳ ڈی، ۹/۳۶، ناظم آباد،کراچی، ۱۹۸۵ء،ص ۳۱۲

۶۔ وقار احمد رضوی،ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۹۱۱

۷۔ ناہید قاسمی، ناصر کاظمی، شخصیت اور فن، فضل حق رایندٔ سنز پبلشرز، لاہور، نومبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۸

۸۔ ناصر کاظمی، اعتبار نغمہ، برگ نے، مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور، چھٹا ایڈیشن، س۔ن، ص ۵

۹۔ سہیل احمد، کھلے منظروں کی دنیا، ماہ منیر، گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور، س۔ن،ص ۱۲

کتابیات

۱۔ حسن رضوی،ڈاکٹر: وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر، ناصر کاظمی ،شخصیت اور فن، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور، ۱۹۹۶ء

۲۔ سہیل احمد، کھلے منظروں کی دنیا، ماہ منیر، گورا پبلشرز، لوئر مال ، لاہور، س۔ن

۳۔ صلاح الدین احمد، شیخ: ناصر کاظمی ایک دھیان، آغاز پبلشرز، دربار مارکیٹ ،لاہور، جولائی ۱۹۹۱ء
۴۔ فتح محمد ملک: منیر نیازی ،ایک تاثر ،فنون، ماہنامہ، احمد ندیم قاسمی، جلد ا ، مئی جون ۱۹۷۰ء
۵۔ گوریجہ، رشید احمد، ڈاکٹر: اردو ادب بیسویں صدی میں، علمی کتاب خانہ ، اردو بازار ، لاہور، س۔ن
۶۔ محمد اکرم، پروفیسر: تاریخِ ادب اردو، علمی بک ہاؤس ، چوک اردو بازار، لاہور ، ۱۹۹۱ء
۷۔ منیر نیازی: ماہ منیر، گورا پبلشرز، ۲۵ لوئر مال ،لاہور، جون ۱۹۷۵ء
۸۔ منیر نیازی: ،غزلیات منیر، گورا پبلشرز، ۲۵ لوئر مال ،لاہور، جون ۱۹۹۴ء
۹۔ ناصر کاظمی: برگ نے ، مکتبہ کارواں، کچہری روڈ ،لاہور، چھٹا ایڈیشن، س۔ن
۱۰۔ ناصر کاظمی، نشاط خواب، مکتبہ خیال، لاہور، طبع اول ،۱۹۷۷ء
۱۱۔ ناصر کاظمی ،دیوان، مکتبہ خیال، لاہور، طبع اپریل ،۱۹۹۶ء
۱۲۔ ناہید قاسمی: ناصر کاظمی شخصیت وفن، فضل حق اینڈ سنز پبلشرز ،لاہور، نومبر، ۱۹۹۸ء
۱۳۔ وقار احمد صدیقی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

رسائل و جرائد

۱۔ تخلیقی ادب ، پاشا رحمان، مشفق خواجہ، ۳ ڈی، ۹/۲۶، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۵ء

مجلّہ ------- تخلیقی ادب (ISSN 1814-9030)

اشاعت ------- سالانہ

شمارہ ------- تین - جنوری دو ہزار چھے

سرورق ------- عابد سیال

ناشر ------- نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، H-9، اسلام آباد۔

مطبع ------- نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد۔

ای میل شعبہ اردو ------- numl_urdu@yahoo.com

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

تخلیقی ادب

شمارہ - تین

(ISSN 1814-9030)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

numl_urdu@yahoo.com

ISSA 1814-9030
تخلیقی ادب
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،
اسلام آباد